ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

ترقی پسند تنقید: ماضی، حال اور مستقبل

PROGRESSIVE CRITICISM: PAST, PRESENT AND FUTURE

***ڈاکٹر محمد امجد عابد**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
****ڈاکٹر فوزیہ شہزادی**
لیکچرر اُردو (وزیٹنگ)، ڈویژن آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
*****عاطف منظور**
لیکچرر اُردو (وزیٹنگ)، ڈویژن آف ایجوکیشن، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract:

Criticism is a broader term. It encompasses human beings' actions, attitudes, and aptitudes which help us look into ups and downs of conditions and determine our perspective and goals. Criticism allows us to probe into good and bad deeds of people and analyse them. This can help an individual or society know their short coming and bringing a balance into their lives. We can say that criticism plays a vital role in making society positive and bringing quality changes into human lives. In the same way literature too is linked with human life and its societal relationships. Literature is in face based on society and human life. Literature depicts a society. Hence literary criticism on its limited scale while evaluation literature, in fact evaluates human beings. Literary criticism also looks into situation by making a triangulation of literature, society and human beings. In this regard, the researcher has analysed the effects on Urdu literature of progressive movement and literary criticism. By making a diachronic study, the result that came to the front was that progressive movement has greatly affected Urdu literature. It has also provided raw material for many other movements.

Key Words: Criticism, Society, Literary Movement, Marxism, Realism, Issues, Revolution, Literature, Contemporary Consciousness, Sociology, Civilization, Communism, Symbolism

کلیدی الفاظ: تنقید، سماج، ادبی تحریک، مارکسیت، حقیقت نگاری، مسائل، انقلاب، ادب، عصری شعور، عمرانیات، تہذیب، اشتراکیت، علامت نگاری

ترقی پسند تنقید اُردو ادب میں خالص ادبی اور تہذیبی اساس کی بنیاد پر وجود میں آنے والی اور انسانی زندگی اور سماج کے درمیان ایک جدلیاتی رشتے کی بنیاد پر زور دینے والی ایک عالمگیر ادبی تحریک ہے جس نے اپنے آغاز سے لمحہ موجود تک نہ صرف اردو زبان بلکہ دوسری زبانوں کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر رہتے ہوئے شاعروں اور ادیبوں نے ادب کی مختلف اصناف کو سماجی صداقت اور معاشرتی حقیقت پسندی کا ایسا درس دیا جس کے بغیر ادب کی کیا خود انسانی سماج کی ترقی بھی ناممکن ہے۔ ترقی پسند تصور ادب کی طرح ترقی پسند تنقیدی زاویوں نے بھی ادبی موضوعات کا ایک جہان آباد کیا۔ مقصدیت، حقیقت نگاری اور مادی جدلیات اس دبستان کے وہ تشکیلی عناصر ہیں جس نے اس کے ڈھانچے کو استوار کیا۔ ترقی پسند تنقید کی فکری اساس بیسویں صدی کے اہم ترین معاشی تصور اور مادی فلسفہ یعنی مارکسیت پر مبنی ہے۔ اسے بعض حلقوں نے سوشلسٹ تنقید، انقلابی تنقید اور سائنٹیفک تنقید کا نام بھی دیا۔ مارکسیت کی بنیاد زندگی کے جدلیاتی عمل پر استوار ہے۔ اس تنقیدی اصطلاح کو ادب میں اسکی اہمیت اور ہمہ گیر اوصاف کی وجہ سے بہت زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ تحریک تنقیدی حوالوں سے معاشرتی زندگی، انسان، سماج اور اس کی عمومی صورت حال کو ٹھوس مادی بنیاد پر دیکھنے کی جستجو کرتی ہے۔ یعنی مادی رشتے، پیداوار کے بدلتے انداز، آلات اور پیداوار کی نئی صورتیں، اقتصادی عوامل سب مل کر انسانی زندگی اور سماج کو ایک خاص شکل میں ڈھالتے ہیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کمی بیشی آتی رہتی ہے۔

ترقی پسند تنقید کا براہ راست موضوع انسان اور اس کی آرزوئیں ہیں۔ اس دبستان کے نمائندہ ناقدین فن عوامی زندگی ہی کے متنوع اور بنیادی مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے سماج پر بات کرتے ہیں۔ عوامی دکھوں اور روزمرہ زندگی میں دکھائی دینے والی عصری بے چینی اور آگہی کو گہری دردمندی کے ساتھ اور اس کے ایک اجتماعی مسئلہ بناتے ہوئے اپنا نکتہ نظر واضح کرتے ہیں۔ ترقی پسند تنقید میں اظہار و اسلوب کے سارے سلسلے حقیقت پسندانہ اظہار سے جڑے ہوئے ہیں۔ یعنی زندگی بُری یا بھلی جیسی بھی ہے

Vol.5 No.2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اس کا وہی نظریہ پیش کرنا ہے جس طرح وہ دکھائی دیتی ہے۔ اسے باغیانہ اور انقلابی ادب بھی کہا گیا اور اسے بعض زاویوں سے اتنا متنازعہ بنا دیا گیا کہ اس کے اصلی خدوخال کہیں فضاؤں میں گم ہوتے محسوس ہونے لگے مگر ہر عہد میں اس کے پیش کاروں نے اس کی حمایت میں جو لکھا وہ زندگی کی سچائی کی طرح اپنی پہچان کراتا چلا گیا اور آج کے جدید ادب میں اس دبستان سے وابستہ اور اس کے نمائندہ قلم کاروں کی ادبی خدمات دوسرے تمام دبستانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ تحریک ادب اور اجتماعی زندگی کی ترجمان ہے۔

ترقی پسند تنقید نگاروں میں اولین نام اختر حسین رائے پوری کا ہے۔ "ادب اور زندگی" کے نام سے انہوں نے جو مقالہ لکھا تھا اسے اس تحریک کا اولین نقش سمجھا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک آرٹ کا مقصد تلاش حسن نہیں بلکہ ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور انسانیت اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اختر حسین رائے پوری کی مذکورہ بالا رائے کے باطن میں ممتاز اشتراکی ادیبوں گورکی اور ٹالسٹائی سے حاصل ہونے والی نظریہ ادب سے استفادے کی جھلک نمایاں ہے۔ مگر مارکسی نظریات کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے اردو ادب کی تنقید کو نئی جہتوں سے ہمکنار کیا۔

اختر حسین رائے پوری کے پہلے تنقیدی مضمون "ادب اور زندگی" کی اشاعت جولائی ۱۹۵۳ء میں رسالہ اردو میں منظر عام پر آئی۔ ان کا مذکورہ مضمون ادبی دنیا میں بہت پسند کیا گیا۔ "اردو شاعری میں عورت کا تصور" اور "اردو افسانہ نگاری میں عورت کا تصور" یہ دونوں مضمون ان کی معروف کتابوں "ادب اور انقلاب" اور "سنگ میل" کا حصہ ہیں جس میں انہوں نے قدیم اردو ادب میں عورت کے تصور کو سمجھنے اور سمجھانے کی بڑی حقیقت پسندانہ کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک عورت جاگیر داری نظام میں محض جنسی آسودگی کا ذریعہ بنی رہی جب کہ عورت اپنے اصل میں اس سطحی تعلق سے بہت آگے کی منزلوں کی چیز ہے۔ ان خیالات کا اظہار یا ان سے ملتے جلتے موضوعی تعلق کو انہوں نے دیگر کئی مضامین میں بھی برتا۔ یہ الگ بات ہے کہ جنسی زندگی بھی کسی حد تک معاشی نظام کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اور اس طرح کے کئی دیگر حقیقت پسندانہ موضوعات کو پہلی بار معاشی نقطہ نگاہ سے پیش کرنے کا سہرا اختر حسین رائے پوری کے سر ہے۔ کیونکہ "اختر حسین رائے پوری نے اخوت و مساوات کی حمایت کی اور روایت شکنی کو زندگی کی بقا کے لیے لازمی قرار دیتے ہوئے یہ تلقین کی کہ زندہ ادب تخلیق کرنے کے لیے ہر تخلیق کار کو مروجہ سماجی اقدار کے خلاف جہاد کرنا پڑے گا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ادیب کا یہ فرض ہے کہ غربت، افلاس اور ظلم کے خلاف عملی قدم اٹھایا جائے اور اپنے افکار سے ادب کو زندگی کا آئینہ دار بناتے ہوئے کاروانِ حیات کو آگے بڑھایا جائے۔"(۱) ان کے نزدیک ادب محض اس لیے جدید نہیں کہ اسے ترقی پسند کہا جائے وہ اس ادب کو جدید ادب سے تعبیر کرتے ہیں جس میں جدید موضوعاتی رجحانات کو اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سے دیکھا جائے۔

سید احتشام حسین ایسے ترقی پسند تنقید نگار ہیں جن کی تنقیدی بصیرت میں جذباتیت سے زیادہ دلیل کی خوبی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ احتشام حسین کسی موضوع کو زیر بحث لاتے ہوئے اس کے حقیقی معیار کی صداقت کو اولیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادیب زندگی کے عام شعور کا حصہ ہے۔ ان کے فکری زاویوں کے سرچشمے اس حکیمانہ شعور سے پھوٹتے ہیں جس میں مارکسی نظریہ ادب کی توضیح و تشریح کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی ایک کتاب "ترقی پسند ادب" کے نام سے جب منظر عام پر آئی تو کہا گیا کہ اس پر مناظرے کا رنگ غالب ہے حالانکہ احتشام حسین کی عمومی تحریریں اعتدال و توازن کی عمدہ مثال پیش کرتی ہیں۔ احتشام حسین کی دوسری اہم کتاب "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" ہے جس میں آپ کا تنقیدی شعور ابھرتا ہے۔ آپ نے ادبی جائزے کے لیے سماجیات اور سیاسی تاریخ کو ملحوظ رکھنے کی تائید کی۔ اس کتاب کو آپ نے تنقیدی تاریخ کے ادوار میں منقسم کیا ہے جن کی تعداد ۱۴ ہے۔ آپ نے ادوار کی بجائے ابواب بندی کی ہے۔ سکسینہ کی تاریخ کی مانند یہ کتاب بھی تاریخ ادب کے نقطہ نظر سے تشفی بخش ثابت نہ ہوئی اور محض ایک جائزے کی حیثیت کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر عبد السلام لکھتے ہیں:

> "احتشام صاحب کی تعریف میں بعض ناقدین نے (خصوصاً ترقی پسندوں نے) جو کچھ لکھا ہے اس کی مثالیں بھی ان کے یہاں مل جاتی ہیں اور بعض دوسرے ناقدین نے ان پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ بھی ان پر صادق آتے ہیں۔ جہاں ادب کے بارے میں گفتگو کرتے کرتے احتشام صاحب کو اپنے عقائد یاد آجاتے ہیں وہ جا اور بے جا انھیں درمیان میں لے آتے ہیں۔ عبارت گنجھلک ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں جو ان کی دوسری آراؤں سے میل نہیں کھاتیں"(۲)

Vol.5 No.2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ترقی پسند ادب پہ مناظرے کے رنگ کی بات شاید اس رد عمل کا نتیجہ ہے جو احتشام حسین کے نظریاتی تصادم کے ذیل میں ان کے ہم عصروں کو اچھی نہیں لگی کیوں کہ انہوں نے تنقیدی نظریات کی توضیح و تشریح میں اور اسے زندگی کی بنیادی قدروں سے ہم آہنگ کرنے میں جن مارکسی نظریات سے الگ راہ نکالی ہے اس کو اساس بنا کر ان کے ترقی پسند دوست ادیبوں نے اپنے نظریات کی تشریح کی ہے۔ تاہم ترقی پسند تنقید میں نظریاتی استقامت کی ایک اہم آواز کے طور پر اس دبستان کے ایوان میں ان کی صدا اپنی اہمیت اور افادیت کا پرچار کرتی رہے گی۔ رومانیت روحانیت اور جمالیات کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعات سے جڑے ہوئے نظری اور فکری سوالات کے خاطر خواہ جوابات بھی ان کی تنقیدی بصیرت سے ہمیں مل جاتے ہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین نے اپنی تحریروں میں ابتدا ہی سے تنقید کے مارکسی نظریے کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ یہ ان کی تنقید کا اساسی پہلو ہے جس کے ثبوت ان کی تنقیدی کتابوں "نقدِ حیات"، "ادب اور شعور"، "ادبی مسائل"، "نئے تنقیدی گوشے"، "غالب ایک مطالعہ"، "نقدِ حرف"، "حالی کے شعری نظریات" اوران کی زندگی کے آخری خطبے "مارکسی جمالیات" میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے مضامین زیادہ تر "نیا ادب" میں شائع ہوتے تھے۔ ان میں ترقی پسند ادب کے سائنٹیفک نظریوں کو ٹھوس اور مفصّل انداز میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے جدید یورپ کے ادبی نظریوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا۔ انھوں نے ادب میں جدید ترقی پسند نظریے کے مختلف پہلوؤں پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جلد ہی ترقی پسند ناقدین میں ایک نمایاں مقام حاص کر لیا۔ "ممتاز حسین کی تنقید کا اساسی رجحان دوسرے ترقی پسند ناقدین سے مختلف نہیں۔ انھوں نے مارکسی نظریات کی وضاحت کی اور اس ضمن میں جمالیاتی حظ اور افادیت، زبان اور شعر کا رشتہ، تخیل کی دنیا اور حقیقت، انفعالی رومانیت وغیرہ مضامین لکھ کر متعدد مباحث کو ترقی پسند نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اپنے اندازِ فکر کے اعتبار سے وہ ایک ایسے نقاد شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ترقی پسند ادب کی بوطیقا لکھی۔ ممتاز حسین کے مضامین سے "ترقی پسند ادب"، "عوامی ادب" اور "مارکسی تنقید کا نظریہ" کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ ان میں ادب کو ایک مخصوص عینک سے دیکھا گیا ہے۔"(۳) ممتاز حسین نے بنیادی طور پر زمانے کے سماجی اور اقتصادی رویوں کو زیر بحث لاتے ہوئے اُن کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ادب پر ماحولیاتی اثرات ظاہر کرتے ہوئے اشتراکی اقدار کو اس طرح اہمیت دی کہ مادی ارتقا سے انسانی بقا کا رشتہ جوڑ دیا۔ انہوں نے ادب کے معنوی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی۔ ان کے نزدیک طبقاتی درجہ بندیوں کے فرق کو ختم کیا جاسکتا ہے کہ سماج کے تمام طبقوں میں مساوات اور اہداف کا بول بالا ہونا چاہیے۔ انھوں نے مارکس اور لینن کے نظریات کے تحت تنقیدی شعور پیش کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کی پستی کی پیشن گوئی کی ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ جمالیاتی اقدار کو پیش نظر رکھے بغیر ادب کا افادی پہلو نہیں دکھایا جاسکتا۔

سجاد ظہیر ایسے ناقد ہیں جو ترقی پسند تحریک کے بانی اراکین میں شامل ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں میں "انگارے" اور "روشنائی" خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں صحافتی شعبے میں رہتے ہوئے انہوں نے جو مضامین اور تبصرے لکھے ان میں بھی ان کے تنقیدی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنے تعلیمی ایام سے ہی ادبی سرگرمیوں، آزادی کی جدوجہد اور امن و مساوات کی حامل تحریکوں سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ ترقی پسند تحریک سے مطابقت رکھنے والے رجحانات و میلانات شروع دن سے ان کے فکری محور میں شامل رہے۔ ادب برائے زندگی کے نظریے کو عملی جامہ پہنایا۔

سجاد ظہیر کی تنقید عصری شعور کی آئینہ دار ہے۔ ان کے ہاں سائنٹیفک بنیادوں، منطقی دلیلوں اور اشتراکی اصولوں کی روشنی میں سماج کو سمجھنے کی سعیملتی ہے۔ "انگارے" کے نام سے انہوں نے جو افسانوی تحریریں مرتب کی ہیں وہ اپنے کرداروں کی پیش کش کے اعتبار سے اور خصوصاً موضوعات کی انفرادیت کے لحاظ سے اردو ادب میں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ سجاد ظہیر کے تخلیق کردہ کرداروں کے پس منظر میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کہانیوں کا پیش کار اپنے گرد و پیش کے حالات سے کتنا باخبر بھی ہے اور نالاں بھی نیز یہ کہ اپنے عصر کے ان سنگین حالات کو بدل دینے کی خواہش اس میں کس قدر ہے۔ "ذکر حافظ" بھی "روشنائی" کی طرح ایسی کتاب ہے جس میں مصنف کی تنقید نگاری ایک صحت مند نظریاتی روایت کی روشنی میں آگے بڑھتی ہے۔ اس کے ذریعے انہوں نے ماضی کی ادبی قدروں کی دریافت کی۔ "ذکر حافظ" محض غزل یا حافظ کی شاعری کا دفاع ہی نہیں کرتی بلکہ اس میں ماضی کے ادب کا مطالعہ، اس کی قدر و قیمت کا تعین اور اس کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات اور ان حالات سے پیدا شدہ ذہنی رویوں کی ترجمانی عمدگی سے کی گئی ہے۔ سجاد ظہیر کے تنقیدی زاویے کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

Vol.5 No.2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"سجاد ظہیر ادب کے مقصدی ہونے کے قائل ہیں اور ان کے خیال میں اس مقصد کی نوعیت سماجی ہونی چاہیے۔ وہ صرف یہ کافی نہیں سمجھتے کہ شاعر قوم کو جگانے کا پیغام دے بلکہ ان کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو جگانے کا بہترین طریقہ استعمال کیا جائے۔" (۴)

آل احمد سرور کا شمار بھی فراق گورکھپوری، حسن عسکری اور مجنوں گورکھ پوری کی طرح انگریزی تنقید کے اثر سے نمو پانے والے اردو تنقید نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے ابتدائی مضامین میں آئی اے رچرڈ، ٹی ایس ایلیٹ کا پرتو بھی کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ خارجیت پسندی اور عصریت کے جیتے جاگتے مسائل کو ادب کی آماج گاہ بنانا اور پھر اسے جمالیاتی نقطہ نگاہ بخشنا ان کا محبوب انداز تنقید ہے۔ ان کے نزدیک ادب اخلاقی اور جمالیاتی ہر دو پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ حسن کے بدلتے ہوئے تصور کو انہوں نے تنقیدی شعور کی آنکھ سے دیکھا اور نئے طرز احساس کے حامل ادب پر بات کرتے ہوئے ماضی کی یادگاروں کو بالکل فراموش کرنے والوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

سرور صاحب کے تنقیدی انداز فکر کو اگر ایک لفظ میں ظاہر کرنا مقصود ہو تو 'توازن' سے بڑھ کر کوئی اور صفت ان کے لیے موزوں معلوم نہیں ہوتی۔ ان کی متوازن شخصیت کے حوالے سے خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

" سرور صاحب نے بھی اس (ترقی پسند) تحریک کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا اور اس کے بعض مثبت پہلوؤں سے متاثر ہوئے لیکن یہ ان کی افتادِ طبع سے بعید تھا کہ اپنے ماضی سے یکسر بغاوت کر کے اور اپنی تخلیقی شخصیت کی نفی کر کے محض کارِ ثواب کی خاطر اس کارواں میں شامل ہو جاتے۔ ترقی پسند ادبی کارناموں اور تصورات کو رد یا قبول کرنے میں انھوں نے جذباتیت یا عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ معروضی نقطہ نظر ہمیشہ ان کی رفاقت کرتا رہا۔ وہ خوبیوں کو سراہتے ہیں تو گمراہیوں کی طرف اشارا بھی کر دیتے ہیں۔"(۵)

ان کے نزدیک ادبی مسائل اور معاملات کو معاصر تاریخ کے آئینے میں دیکھتے ہوئے کسی شخصیت کا نفسیاتی اور ماحولیاتی جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ ان کے تبصروں میں توازن اور نئی ادبی قدروں کی خوبیوں کو مثبت انداز نظر سے دیکھنے کا زاویہ نمایاں ہے۔ ان کا تنقیدی وصف یہ ہے کہ ترقی پسند ادبی کارناموں اور ترقی پسند ادبی تصورات کو رد یا قبول کرنے میں انھوں نے جذبات نگاری سے کام نہیں لیا۔ بلکہ انہیں معروضی انداز نظر سے دیکھا اور دکھایا۔ جہاں ترقی پسندانہ انداز نظر کے حامل تنقیدی رویوں میں انہیں کوئی خوبی نظر آئی اس کا بھی برملا اظہار کیا اور جہاں اس کے معائب پر نظر پڑی وہاں ان کی طرف بھی اشارا کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے ادیب کو آزاد چھوڑ دینے پر اصرار کیا کیونکہ ان کے نزدیک یہ آزادی کسی ادیب کو جماعتی سیاست کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔ مگر اس کا انتخاب اسے خود کرنا چاہیے۔ ان کے فکر و فن میں یکسانیت کے عناصر اسی لیے ہیں کہ وہ کسی دوئی کے قائل نہیں۔ انہیں پہلودار اور فکری سربلندی کے حامل نظریات اور شاعری پسند ہیں اور انہی کی تشریح و توضیح کرنا انہیں اچھا لگتا ہے۔ انہوں نے اپنے تنقیدی کام کو "پیچان اور پرکھ"، "نئے اور پرانے چراغ"، "ادب اور نظریہ"، "تنقیدی اشارے"، "عرفان اقبال"، "تنقید کیا ہے"، "نظر اور نظریے" اور "نقطہ نظر" وغیرہ میں سمیٹا ہے۔

آل احمد سرور نے خالصتاً ترقی پسندانہ زاویہ نگاہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ادب برائے ادب کی نفی کی اور ادب برائے زندگی کو انسان کی سماجی اور عمرانی کیفیتوں اور تہذیبی آثار کا حاصل قرار دیا۔ ان کا شمار ایسے افراد میں نہیں ہوتا جو مغرب زدگی کا شکار رہے ہوں۔ یہ بات دوسری ہے کہ انہوں نے مغربی افکار سے مثبت انداز میں استفادے سے اپنے علمی سرمائے میں اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آرنلڈ کی طرح ادب کو تنقید حیات سے تعبیر کرنے والوں کی صف میں خود کو شامل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے نمایاں نقادوں میں عزیز احمد کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی معروف کتاب "ترقی پسند ادب" ہے۔ جس میں انھوں نے انقلابی قدریں، جدید تحریک اور اُردو شعر و نثر کی مختلف اصناف میں ترقی پسندی کی وضاحت کی اور صحیح نقطہ نظر پیش کیا۔ ان میں نظریات کے حوالے سے کوئی تنگ نظری نہ تھی۔

نتائج کی ہمہ گیریت اور گہرا فکری زاویہ محمد حسن عسکری کی تنقید کا اختصاص تھا۔ ترقی پسند نظریات کی مخالفت میں آپ نے ادب برائے ادب اور فن برائے فن کے نظریات کی برملا تائید کی۔ فن کو حقیقت کی تلاش کا ذریعہ بنایا اور فن کار کو آدمیت کی سطح سے اٹھا کر زندگی کو برتنے کا بہترین آلہ کار بنا دیا۔ عسکری کے جدید نظریات نے بالخصوص تنقیدِ ادب کو متاثر کیا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ادب میں جو نئے رجحانات پیدا ہوئے اور پاکستانی ادب اور اسلامی ادب جیسے مباحث کے سوتے عسکری کی تنقید ہی سے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

پھوٹتے ہیں مزید بر آں ڈاکٹر جمیل جالبی، سلیم احمد، ممتاز شیریں، انتظار حسین اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی شکل میں جو دبستانِ تنقید وجود میں آیا اس کی کڑیاں عسکری سے ہی ملتی ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا بھی تنقید ادب میں خاطر خواہ زرخیزی کی حامل شخصیت ہیں۔ تخلیق کے متعلقہ تمام ظاہری و باطنی اُمور کو بحیثیت جزوی پرکھنے کے بعد ایک فکری کُل سے جوڑنے کا رجحان ان کا پیدا کردہ ہے۔ تنقید ادب کو نئی راہ بخشتے ہوئے انھوں نے "امتزاجی تنقید" کا نظریہ پیش کیا۔ ان کے بعد جیلانی کامران نے ادب میں علامتی تناظر اور روحانی اقدار کو متعارف کروایا۔ انتظار حسین تہذیبی رویوں سے تنقید کو متعارف کرواتے ہیں۔ مجلسی تنقید کی ابتدا حلقہ اربابِ ذوق ہی کے توسط سے تنقید میں ہوئی۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید جس طرح بامِ عروج پر پہنچی اسی طرح ٹوٹے تارے کی مانند گہنا گئی۔ حلقے میں ترقی پسند ادبا کی شمولیت کے بعد حلقے کے جوش و خروش کا خاتمہ ہو گیا۔ تاہم آج بھی اربابِ ذوق کی دیرینہ روایت قائم و دائم ہے۔ تاہم برائے نام اور بے روح، ہاں البتہ منتشر ہونے والے ادبا انفرادی سطح پر ادب کی تخلیق میں مصروف عمل ضرور ہیں۔

ترقی پسند تحریک کا جب شیرازہ بکھرنے لگا اور اشتراکیت نے لادینیت اور الحاد کا روپ دھار لیا تو اس کے ردِّ عمل کے طور پر اسلامی ادب کی تحریک وجود میں آئی جس کا مقصد اسلامی نظریات اور فن کی اشاعت تھی۔ چنانچہ ادبا کو شعوری طور پر اس طرف متوجہ کیا جانے لگا اور ایسا نظام رائج کرنے کی طرح ڈالی گئی جو اسلام کی اساسی بنیادوں کے ساتھ میل کھاتا ہو۔ اس تحریک نے فحاشی، بے حیائی، لادینیت اور ہر اس نظامِ فکر کی مخالفت کی جو اسلامی نظریات سے ٹکراتا تھا۔ چنانچہ فروغ احمد کا مقالہ "اسلامی ادب کی تحریک"، پروفیسر ہارون الرشید کا مقالہ "اردو ادب اور اسلام" اس کے علاوہ تحریک کے آغاز میں جو بہترین ناقدین مہیا ہوئے ان میں نعیم صدیقی، اسعد گیلانی، ابن فرید، نجم الاسلام، خورشید احمد اور اسرار احمد سہاروی زیادہ اہم ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی اس تحریک کے بڑے رکن ہیں جنھوں نے معاش کے لیے ادب پیدا کرنے کو غیر ادبی و باطل نظریہ کہا۔ ماہر القادری بھی اس تحریک کے ہمہ جہت رکن تھے جنھوں نے تنقید، شاعری، افسانہ اور مزاح لکھا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے نام بھی ہیں جنھوں نے اسلامی ادب کو پروان چڑھانے میں کردار ادا کیا مگر یہ گروہ تحریک سے باقاعدہ وابستہ نہ تھے ان میں نصیر الدین ہاشمی، شوکت سبزواری، ابواللیث صدیقی اور حسن فاروقی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ تاہم ادب اسلامی کی یہ تحریک جلد ہی منظر سے غائب ہو گئی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

> "تحریک ادب اسلامی چونکہ ردّ عمل کی تحریک تھی۔ اس لیے اس کے ڈھانچے اور طرزِ عمل میں اختراع یا اُپج کا نیا پہلو نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک نے ہفتہ وار جلسوں میں حلقہ اربابِ ذوق کی اور تنظیمی امور میں ترقی پسند تحریک کی تقلید کی۔ چنانچہ جب ترقی پسند تحریک پر پابندی لگ گئی تو اسلامی ادب کی تحریک کا مضبوط حریف منظرِ عام سے اوجھل ہو گیا اور ردّ عمل کا ولولہ بھی آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی طرح اسلامی ادب کی تحریک بھی بہت جلد شخصیت پرستی کا شکار ہو گئی۔" (۶)

پاکستانی ادب کی تحریک بھی قیام پاکستان کے فوراً بعد حرکت میں آ گئی۔ قیام پاکستان کو تاریخی واقعہ کی حیثیت سے اٹھا کر فکری انقلاب کی حیثیت سے قبول کرنے اور ثقافتی جہت متعین کرنے کے علاوہ ارض پاکستان کی نسبت زمینی اور اسلامی نظریات کی نسبت کے تحت ادب تخلیق ہونے لگا اور نئے ادب کی تخلیق میں زمینی و آسمانی عناصر کا امتزاج لازمی ٹھہرا۔ اس تحریک کے پہلے علمبردار محمد حسن عسکری تھے ان کے علاوہ سجاد باقر رضوی، انتظار حسین، مظفر علی سید، سلیم احمد، ممتاز شیریں اور ڈاکٹر جمیل جالبی تھے جنھوں نے اس تحریک کو نظریاتی اساس فراہم کی اور یہ دوبارہ حلقہ ارباب ذوق میں ضم ہو گئی۔

"ارضی ثقافتی تحریک" نے پاکستانی ادب کی تحریک کے بطن سے جنم لیا اور بعض ناقدین نے تو ارضی ثقافتی تحریک کو "پاکستانی ادب کی تحریک" کی بدلی ہوئی صورت قرار دیا۔ تاہم یہ تحریک بہت سے مستعار نظریات سے اپنا خمیر چنتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس تحریک کے سب سے بڑے نظریاتی مؤسس ہیں۔ آپ کی کتاب "اُردو شاعری کا مزاج" اس سلسلہ کی کڑی ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر سہیل بخاری، مشتاق قمر، جمیل آذر، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور سجاد نقوی کے نام اہم ہیں۔ اس تحریک کی اردو ادب کو سب سے بڑی عطا "انشائیہ" ہے۔ انشائیہ ہی سب سے پہلے ارضی مظاہر اور ثقافتی نقوش کے علاوہ آسمانی عناصر کو مس کرنے والی صنف بنی۔ آسمانی عناصر ہی سب سے پہلے شک کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے پھر اس کے بعد اعتراضات کے انبار لگ گئے اور قومی و ملی جذبے کے فقدان اور ارضیت پرستی اور بت پرستی جیسے رویوں کو برداشت کرتے ہوئے یہ تحریک ایک بار پھر مضبوط ہوئی اور آزادی کے بعد اس نے تقویت حاصل کی چونکہ اس تحریک میں شدّت، گھٹن اور تعصب نہیں ہے اس لیے یہ تحریک زمانہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.5 No.2 2022

حال میں بھی جاری و ساری ہے۔ ان تحاریک کے ساتھ ساتھ علامت نگاری کی تحریک نے بھی اردو ادب میں کچھ عرصہ کے لیے اپنا آپ منوایا اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے اسے تقویت بخشی۔ علامت نگاری کی تحریک کے علاوہ "لسانی تشکیلات" کی تحریک بھی اردو ادب میں اہم تحریک مانی جاتی ہے اور "افتخار جالب" کی ذات سے یہ تحریک پھوٹ کر ان ہی کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جن مخالفتوں کا انھیں سامنا ہوا انھیں کا اس تحریک کو بھی ہوا۔ اس تحریک کے بعد اردو ادب میں انفرادی رجحاناتِ تنقید زور پکڑ جاتے ہیں اور اجتماعی رویہ تنقید کی اگر کوئی صورت نظر آتی ہے تو دبستانوں کی صورت میں نظر آتی ہے۔

تنقید جب انفرادی رویوں میں ظہور پاتی ہے تو نظریاتی اختلافات کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ اختلافات کی یہ بڑھتی ہوئی گنجائش جب اجتماعی اثر و رسوخ حاصل کرتی ہے تو خیالات کی زرخیزی اور زندہ ادب تخلیق ہونے کی علامت بنتی ہے۔ انفرادی اختلاف رائے میں شدت نہیں ہوتی۔ انھیں انفرادی نظریاتی رویوں کی اجتماعی صورت دبستان کہلاتی ہے۔ دبستان دوسرے لفظوں میں وحدت میں موجزن کثرت کا دوسرا روپ ہے۔ اگرچہ اصل کی وحدت ہی کثرت کا سبب بنتی ہے تاہم اس کے اجزا بھی اپنی اپنی ذات میں وحدت کا درجہ رکھتے ہیں۔ کسی بھی دبستان کی نظریاتی وحدت اس کے افکار کی کثرت پر قدغن نہیں لگاتی یوں ایک نظریہ تنقید کی گود میں مختلف اندازِ فکر سما جاتے ہیں اور ہر نقاد اپنے زاویہ نظر سے معنوی وسعتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر "گویا سیدھے سادے الفاظ میں کسی بھی نظام فکر (وحدت) سے وابستہ افراد اور ان کی ذہنی کاوشوں (کثرت) کو دبستان (شجر) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔"(۷)

اب تک کم و بیش سترہ (۱۷) دبستانِ تنقید وجود میں آ چکے ہیں۔ ان میں جمالیاتی، تاثراتی، رومانی، تاریخی، تشریحی، عمرانی، مارکسی، اسلوبیاتی، ساختیاتی، پس ساختیاتی، نفسیاتی، تقابلی، سائنٹیفک اور امتزاجی دبستانوں کے نام نمایاں ہیں۔ عمرانی تنقید کے ذیل میں ڈاکٹر جمیل جالبی، مظفر علی سید، آل احمد سرور، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، سلیم احمد، محمد حسن عسکری، فتح محمد ملک، ڈاکٹر انور سدید، انیس ناگی، یحییٰ امجد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر ضیاء الحسن کے نام نمایاں ہیں۔ نفسیاتی تنقید کے ضمن میں وحید الدین سلیم، مرزا محمد ہادی رسوا، عبد الماجد دریابادی، میراجی، ڈاکٹر سلیم اختر، سلیم احمد، ریاض احمد، ابن فرید، دیوندرا، ڈاکٹر سلام سندیلوی، سید محمود الحسن رضوی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

جدید ترقی پسند نظریات کے حامل نقادوں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر آغا سہیل، وقار عظیم، خلیل الرحمن اعظمی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے نام نمایاں ہیں۔ ساختیات اور پس ساختیات کے ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ناصر عباس نیّر، اسلوبیات کے حوالے سے سید عابد علی عابد نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیقی عمل میں سائنس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور انھوں نے امتزاجی تنقید کا ڈول ڈالا۔ جب کہ ڈاکٹر جیلانی کامران نے تنقید کے پس منظر میں تہذیب کو دریافت کرنے کی سعی کی۔ مختصر یہ کہ تنقید انفرادی رجحانات میں اپنا ارتقائی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نعیم تقوی، ڈاکٹر، تنقید و تعبیر، کراچی، غضنفر اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۲

۲۔ عبد السلام، ڈاکٹر، جدید اُردو تنقید کے معمار، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۱

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، اشاعت ششم، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۵۸ء، ص ۵۲۵، ۵۲۶

۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا ارتقاء، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳۳

۵۔ خلیل الرحمن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۲، ۳۳۷

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر اُردو ادب کی تحریکیں، ۱۹۵۸ء، ص ۶۰۹

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۴۰